ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

رومی کی چند تشبیہات

(۳)

دین و دانش دونو کے لئے ایک اہم مسئلہ شر کا وجود ہے خصوصاً اس دین کے لئے اس کا حل نہایت اہم ہے جو خدا کو رحیم و کریم، سراپا رحمت اور قادرِ مطلق سمجھنا جزوِ ایمان قرار دیتا ہے۔ اگر خدا میں قدرتِ مطلقہ بھی ہے اور وہ رحمتِ تامہ بھی ہے تو پھر دنیا میں شر کہاں سے آیا۔ توحیدی مذاہب نے اس اشکال کو کئی توجیہات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں، فقط عارفِ رومی کا ایک استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ خدا کا اصلی مقصود یہ ہے کہ انسانوں میں خیر کا احساس پیدا ہو۔ وہ خیر اندیش بھی ہوں اور خیر کوش بھی۔ لیکن اس عالمِ امکان میں کسی صفت کا شعور اس کی ضد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگر انقلاب روز و شب نہ ہوتا اور ہمیشہ دن ہی دن رہتا تو کسی شخص کو نہ روشنی کی قدر ہوتی اور نہ اس کا احساس۔ فرماتے ہیں کہ خدا فطرتِ خارجی میں اور فطرتِ انسانی میں اور احوالِ افراد و اقوام میں اس لئے رد و بدل کرتا رہتا ہے کہ ان کو مصیبت کے مقابلے میں راحت کا احساس ہو اور وہ شکر گزار ہوں ——— قدرِ راحت آنکس داند کہ در مصیبت گرفتار آید (سعدی)

زندگی میں نحس و سعد اور عسر و یُسر کا جزرومد حکمت آمیز مشیت ایزدی ہے:

آں نظر کہ بنگرد ایں جسزرومد   او ز نحسے سوئے سعدے نقب زد

زاں ہمی گرداندت حالے بحال   ضد بضد پیدا کناں در انتقال

تا نہ از عُسرے ببینی خوف ہا   کے ز یُسرے بازیابی لطف ہا

اس کے بعد کیا عمدہ تشبیہ استعمال کی ہے کہ خیر و شر، رحمت و زحمت، راحت و کلفت زندگی کے دو پر ہیں۔ زندگی ان دو پروں کے ساتھ ہی پرواز کر سکتی ہے۔ ایک پر کے ساتھ کوئی پرندہ نہیں اُڑ سکتا اس لئے یہ شکایت کرنا کہ خدا نے خیر کے ساتھ شر کو کیوں پیدا کیا نہایت نامعقول بات ہے۔ شر بھی بالواسطہ ذریعہ خیر ہے اور خیر کے لئے مقدم ہے۔ "خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد":

تا دو پر باشی کہ مرغِ یک پرہ   عاجز آمد از پریدن یکسرہ

حکیم المانوی کانٹ نے بھی پرند کی پرواز سے شر کو ذریعہ خیر ثابت کرنے کے لئے ایک حکیمانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ پرندے کی ہوا میں پرواز ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے ہے۔ پرو بازو سے اس مزاحمت کا مسلسل مقابلہ پرندے کو ہوا میں اُڑاتا ہے۔ اگر کسی فضا میں ہوا نہ ہو اور خلائے مطلق ہو تو پرندہ اس میں ایک گز کی پرواز بھی نہیں کرسکتا۔ اگر پرندے میں انسانِ شاکی کی قسم کا شعور ہو اور وہ یہ کہے کہ ہوا مزاحم نہ ہو تو میں قوت صرف کئے بغیر اُڑوں تو اس کا یہ خیال سراسر حماقت ہوگا۔ اسی طرح انسانی زندگی کی رکاوٹیں اور مزاحمتیں ہی انسانی قوتوں کے بقا و ارتقاء کا لازمی سبب ہیں۔ جو شخص یہ پوچھتا ہے کہ شر کیوں ہے وہ حقیقت میں یہ پوچھ رہا ہے کہ زندگی ہی کیوں ہے۔ کیونکہ زندگی اضداد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی اور کسی خیر کا وجود شر کے بغیر تصوّر ہی میں نہیں آسکتا۔

قرآن کریم میں آیت کا لفظ دو معنوں کا حامل ہے۔ ایک معنی تو قرآن کی عبارت کا ایک حصّہ ہے اور آیت کے دوسرے معنی نشانی ہیں۔ قرآن کریم کی آیات دو نو معنوں میں آیات ہیں۔ انفس و آفاق میں جو کچھ ہے وہ از روئے قرآن خدا کا پتہ دینے والی نشانیاں ہیں۔ انقلابِ لیل و نہار، رفعتِ سما و وسعتِ ارض، جمالِ کائنات، نشو و نمائے نباتات، فطرت کے غیر متغیر قوانین، تاریخ اُمم کے نشیب و فرازِ حیات و کائنات، علاماتِ خلاقِ حکیم سے لبریز ہیں۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

کچھ آیات یا نشانیاں خدا کی طرف رہبری کرتی ہیں اور کچھ نشانیاں بندگانِ حق اولیاء و انبیاء کی سیرتوں کے متعلق ہیں کہ اگر تمہیں ایسا ایسا شخص ان ان صفات والا دکھائی دے تو اسے ہدایت یافتہ اور ہادی سمجھو جس کی پیروی تم کو زندگی کے تمام مقاصدِ عالیہ کے حصول میں معاون ہوگی۔ مولانا تمثیلاً لکھتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک شخص خواب میں ایک مبارک نورانی صورت والے بزرگ کو دیکھے جو اس کو مخاطب کر کے یقین اور طریقے سے کہے کہ اگر تم اپنی تمام مرادیں حاصل کرنا چاہتے تو میں تمہیں ایک شخص کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں جو تمہارے پاس آئے گا۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے اس کی کچھ نشانیاں بتاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ سوار ہوگا، تمہارے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے گا۔ اور اس خواب کی سچائی کی ایک اور خاص نشانی یہ ہوگی کہ اگر تم صبح کو بیداری میں کسی سے بیان کرنا چاہو گے تو تمہاری زبان بند ہو جائے گی۔ جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی خوش خبری دیتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے ایک نشانی یہ بتائی تھی کہ وہ تین روز تک بالکل بات نہ کرسکیں گے۔ اور فرض کرو کہ اس کے علاوہ بھی اور کئی نشانیاں وہ بزرگ خواب میں تمہیں بتائے، تاکہ تمہیں اپنے مراد بخش مربّی کی پہچان میں کچھ غلطی نہ ہو۔ اس کی ملاقات کے بعد تم وہ مرادیں حاصل کرلو گے جن کے لئے تم نے عمر بھر بے خواب راتیں گزاری ہیں اور بے حساب آنسو بہائے ہیں۔ اب تم صبح ہونے پر ہر طرف کوئے و بازار و سرا میں اسے ڈھونڈنے نکلو گے۔ لوگ پوچھیں گے کہ حضرت کس کی تلاش ہے۔ تم ہر

مردِ سوار کو غور سے تکنے لگو گے۔ ہر سوار تم سے کہیگا کہ بھائی مجھے اس طرح کیوں گھور کر دیکھ رہے ہو۔ تم کہو گے معاف کرنا میرا ایک دوست سوار آنے والا ہے میں اس کی تلاش میں ہوں۔ پھر یک بیک وہ خواب میں نشان دار سوار آموجود ہو گا۔ تم اس سے بغل گیر ہو کر فرطِ شوق سے بے ہوش ہو جاؤ گے۔ دوسروں کو کیا معلوم کہ تمہیں کیا ہو گیا کہ ایک سوار سے ملتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

اسی طرح خدا اپنی کتاب میں انبیاء کی بہت سی نشانیاں بتاتا ہے کہ ان کا کلام اس قسم کا ہوتا ہے۔ ان کی سیرت اس قسم کی ہوتی ہے عام لوگ ان سے اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کچھ خاص نکتہ فہم ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو میں انقلاب کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ خیر و شر کا معیار بدل دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان بیان کردہ نشانیوں کی رہبری سے جب کوئی شخص انبیاء کو پہچان لیتا ہے تو اس کی والہانہ عقیدتمندی کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ کسی معجزے اور کرامات سے ایمان نہیں لاتا بلکہ اس کے لئے "روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است"۔

اسی طرح خدا نے اپنی بھی بہت سی نشانیاں آیاتِ کتاب میں بتائی ہیں ان نشانیوں سے خدا کو پا لینے والے بھی حسبِ عادہ اپنے مقصودِ حیات کو پا لیتے ہیں۔ حکمت بھی مومن کی گم شدہ اونٹنی ہے۔ وہ اس کی علامتوں کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ جہاں کہیں بھی مل جائے وہ اسی کا مال ہے۔ فطرت کے اندر خدا کی نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں اگر خدائے جمیل کی جمال آفرینی نہ ہوتو :

کہ گلستاں راز گوید با چمن کہ بنفشہ عہد بندد یاسمن
کہ چنارے کف کشاید در دعا کہ درختے بر فشاند میوہ را
کہ شگوفہ آستینِ پُر نثار بر فشاندن گیرد ایامِ بہار
کہ فروزد لالہ را رُخ ہمچو خوں کہ گل از کیسہ بر آرد زرِ بروں
کہ بیاید بلبل و گل بو کند کہ چو طالب فاختہ کو کو کند
کہ بگوید لکلک آں لک لک بجاں لک چہ باشد ملک لک یا مستعاں
کہ نماید خاک اسرارِ ضمیر کہ شود چوں آسماں بستاں منیر

از کجا آوردہ اند ایں حلہا من کریم من رحیم کلہا
آں لطافتہا نشانِ شاہدے ست کہ بہر ساعت دو صد جانش فدے ست

انبیاء کو پہچاننے کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی پہچان بھی انہیں خواص کو ہوتی ہے جن کی روح ان کی

سیرت کی نشانیوں سے آشنا ہے:

پس نشانیہا کہ اندر انبیا راست　　خاص آں جاں را بود کو آشناست

نبی کریمؐ کا یہ ارشاد کہ الحکمۃ ضالۃ المومن (حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے) عارفِ رومی کو ایک حکیمانہ شرح پر مجبور کرتا ہے اور اس توضیح میں انہوں نے بہت لطیف نکات بیان فرمائے ہیں۔ دین عین حکمت ہے جو شخص سچے دل سے حکمت کا طالب ہے وہ دین ہی کا طالب ہے۔ مولانا کا عقیدہ یہ ہے کہ روح انسانی قبل از آفرینش خدا سے آشنا ہو چکی ہے اس لئے اگر حوادثِ روزگار، جسمانی آلائشیں اور خواہشیں اس کو طلبِ حقیقت میں گمراہ نہ کریں اور حق اسے روبرو نظر آئے تو وہ ضرور اس کو پہچان لے عین اسی طرح جس طرح مالک اپنی گم شدہ اونٹنی کو پہچان سکتا ہے:

اشترے گم کردی وجستیش چست　　چوں بیابی، چوں ندانی کان تست

ضالہ چہ بود ناقۂ گم کردۂ　　در کفت بگریختہ در پردۂ

انسانوں کی زندگیوں کا قافلہ آگے چلنے کے لئے اونٹوں پر اسباب لاد رہا ہے۔ ہر مالک اپنے اونٹ اور اپنے اسباب کے ساتھ ہے لیکن جس کا اونٹ گم ہو گیا ہے وہ پریشان ہے، اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے، قافلہ دور ہو رہا ہے رات کی تاریکی نے آلیا ہے تمہارا اسباب وہیں زمین پر پڑا ہے، اونٹ گم ہے اور تم اس کی تلاش میں رواں دواں، حیران و پریشان گزرنے والے لوگوں سے پوچھتے ہو کہ کسی نے میرا اونٹ دیکھا ہے جو علی الصباح کھل کر کہیں آوارہ ہو گیا ہے۔ لوگو میرا اونٹ بہت قیمتی ہے۔ اگر کوئی اس کا پتہ نشان بتائے تو میں اس کو اتنے دام انعام دوں گا۔ اِدھر اُدھر لفنگوں نے جو اس کو دیوانہ وار حواس باختہ دیکھا تو انہوں نے تمسخر شروع کر دیا کہ ہاں ہم نے ایک سُرخ اونٹ اُدھر چراگاہ کی طرف جاتا ہُوا دیکھا ہے۔ اس کے پیچھے فلاں طرف بھاگو تو مل جائے گا۔ ایک ہنسی اُڑاتا اور کہتا ہے کہ بھئی وہی اونٹ ہے نا جس کے کان کٹے ہوئے تھے دوسرا بولتا ہے کہ وہ تو نہیں تھا جس کی جھول پرنقش و نگار تھے تیسرا کہتا ہے وہ کانا اونٹ تو نہیں تھا، جس کو میں نے شمال کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ چوتھا بولتا ہے کہ نہیں وہ ہو گا جس کا جسم خارش سے بے پشم ہو گیا تھا اسے تو میں نے دیکھا ہے غرضیکہ کوئی تمسخر سے اور کوئی انعام کی توقع میں طرح طرح کی نشانیاں بیان کر رہا ہے۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ حکمت و معرفت الٰہی کی گم شدہ اونٹنی 'ضالۃ المومن' کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ انسانوں کی فطرت طالب حق ہے اور روح انسانی کو اپنی اصلی اور خاص حالت میں حقیقت کی پہچان بھی ہے لیکن غرض کے بندوں، احمقوں اور مسخروں نے انسان کو پریشان کر رکھا ہے:

ہمچناں کہ ہر کسے در معرفت　　می کند موصوفِ غیبی را صفت

آنانکہ حُسنِ روئے تو تفسیر می کنند　　خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند　　(حافظ)

حرم جویاں درے رامی پرستند — فقیہاں دفترے رامی پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد — کہ یاراں دیگرے رامی پرستند (عرفی)

فلسفی اس کی ایک طرح شرح کر رہا ہے اور متکلم اس پر جرح وقدح کر رہا ہے۔ ہر ایک راہِ حق کا پتہ اس انداز سے بتاتا ہے کہ گویا اس راستے سے بخوبی واقف ہے:

ہر یکے زیں رہ نشاں ہا می دہند — تا گماں آید کہ ایشاں زاں رہ اند
فلسفی از نوع دیگر کرد شرح — باحثے بر گفت اورا کرد جرح
واں دگر در ہر دو طعنہ می زند — واں دگر از زرق جانے می کند
ہر یکے زیں رہ نشاں ہا مید ہند — تا گماں آید کہ ایشاں زاں رہ اند

اس کے بعد مولانا بہت فراخ دلی سے کام لے کر فرماتے ہیں کہ ان مختلف فلسفوں اور مذاہب کے متعلق یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سر بسر غلط ہے۔ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ:

خط غلط مضمون غلط املا غلط انشا غلط

کوئی فلسفیانہ مذہب ہو یا دین کا کوئی فرقہ اس میں باطل کے ساتھ حق کی بھی آمیزش ہوتی ہے اگر اس میں کوئی حق کا پہلو نہ ہو تو فطرتِ انسانی بطلانِ محض کو کبھی قبول نہ کرے:

ایں حقیقت داں نہ حق اند ایں ہمہ — نے بباطل گمرہاں اند ایں ہمہ

ہر فرقے کو ماننے والا معتقد گروہ اس لئے مل جاتا ہے کہ اس کے باطل میں کچھ نہ کچھ حق کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کی مثال مولانا یہ دیتے ہیں کہ عام طور پر کھوٹے سکے وہ ہوتے ہیں جن میں سونے اور چاندی میں کچھ تانبا وغیرہ ملا ہوتا ہے۔ سونے اور چاندی کی آمیزش سے لوگ دھوکہ کھا کر انہیں قبول کرنے میں عذر نہیں کرتے۔ کھوٹے سکے اصلی سکوں کی بدولت چلتے ہیں۔ اصل دنیا میں سچ کا عام رواج نہ ہو تو کسی جھوٹ بولنے والے کو جھوٹ سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا وہ تو جھوٹ اس لئے بولتا ہے کہ دوسرا شخص سچ سمجھ کر اس کا اعتبار کرلے۔ گندم کے وجود کی وجہ سے گندم نما جو فروش لوگوں کا فریب چل جاتا ہے۔ اس لئے یہ کبھی نہیں کہنا چاہیئے کہ تمام ادیان ہمارے دین کے علاوہ مطلقاً باطل ہیں۔ ان ادیان نے جو لوگوں کو معتقد اور گرویدہ بنا رکھا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ ان میں کم وبیش بوئے حق پائی جاتی ہے۔ مولانا کے سوانح میں ایک جھگڑالو حکمت سے معرّا ملّا کے متعلق ایک روایت درج ہے کہ وہ یہ سن کر کہ مولانا کافرانہ اور ملحدانہ باتیں کرتے ہیں ان کے پاس بغرضِ مناظرہ آیا۔ مناظرے کے پینترے گھر سے سوچ کر آیا تھا پہلا وار یہ تھا کہ یہ پوچھوں گا کہ بحث سے پہلے آپ یہ فرمائیے کہ آپ بہتّر فرقوں میں سے کس

فرقے میں ہیں جس فرقے کا وہ نام لیں گے پھر اس کے اندر کچھ پخنی دینے والے سوال کروں گا چنانچہ اس نے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا تو اس کو ایسا نہایت غیر متوقع جواب ملا کہ وہ اپنا پنیترا بھول گیا۔ مولانا نے جواب یہ دیا کہ میں تو ہفتاد و دو ملت سب سے متفق ہوں۔ ملا اس کا مطلب خاک سمجھتا۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ سب میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے، جس کو غلو نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ جھنجلا کر بولا کہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ ملحد ہیں۔ مولانا نے متبسّم ہو کر فرمایا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔ اب تو ملا کی سٹی گم ہو گئی اور مناظرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اذا مرّوا باللغو مرّو کراما:

این حقیقت داں نہ حق اند این ہمہ — نے بیاطل گمرہانند این ہمہ
زانکہ بے حق باطلے ناید پدید — قلب را ابلہ ببوئے زر خرید
گر نبودے در جہاں نقدِ رواں — قلب ہا را خرج کردن کے تواں
تا نباشد راست کے باشد دروغ — آں دروغ از راست می گیرد فروغ
بر امیدِ راست کشر رامی فرند — زہر در قندے رود آنگہ خورند
گر نباشد گندمِ محبوب نوش — چہ برد گندم نمائے جو فروش

پس مگو کایں جملہ دیں ہا باطل اند
باطلاں بر بوئے حق دامِ دل اند

آج کل اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے ہیں کسی کا پیشوا مجددیت کا دعوےٰ کرتا ہے، کسی کے مرید اس کو جامع المجددین کا خطاب عطا کرتے ہیں کوئی مہدی مسعود و مسیح موعود ہے، کوئی مزاج شناسِ رسول ہے اور کوئی مزاج شناسِ خدا۔ سب نے اپنے گرد کم و بیش تعداد کی ٹولیاں جمع کر لی ہیں۔ ان کو جتنی کامیابی ہوئی ہے اس کی وجہ وہی ہے جو عارفِ رومی نے بیان کی ہے۔ ان لوگوں کی تحریریں پڑھو تو جا بجا نہایت اچھی اور معقول باتیں نظر آتی ہیں۔ انہیں باتوں کی وجہ سے بعض اوقات معقول لوگ بھی ان کے قدردان ہو جاتے ہیں، لیکن جہاں اچھی باتوں کی وجہ سے قدردانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا وہیں اقتدار پسندی اور کبر و نخوت کی شراب مغز کو چڑھ گئی۔ چونکہ ظرف کم ہوتا ہے اس لئے نشہ جلدی چڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو انسان دیوانہ کہے یا دیوانہ بکارِ خویش ہشیار۔ لیکن رواداری اور فراخدلی کا تقاضا وہی ہے جس کا اظہار مولانا روم نے مندرجہ صدر اشعار میں کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے عقائد اور ان کی تعلیمات میں جو حق ہے اس کو حق سمجھ کر اس سے اتفاق کرنا چاہئے، مگر اس کے ساتھ باطل کی جو آمیزش ہے اس زہر کو قند سے الگ کرنا ہر حق پرست اور منصف مزاج مومن کا فرض ہے۔

اس کے بعد مولانا پھر اس سوال کی طرف عود کرتے ہیں کہ خدا جو سراپا حق ہے اس نے باطل کو کیوں پیدا کیا اور خلاقِ فطرت جو خیرِ مطلق ہے اس نے ہستی میں شر کو کیوں گوارا کیا۔ اس کا جواب مولانا یہ دیتے ہیں خیرِ مطلق تو مجبورِ محض مخلوق ہی ہو سکتی ہے لیکن خدا نے اگر انسان کو ایک حد تک صاحبِ اختیار ہستی بنایا ہے تو اختیار کے ساتھ آزادی کے غلط استعمال کا احتمال لازمی ہے۔ علاوہ ازیں یہ دنیا ارواح کے لئے سیرت سازی کا کارخانہ ہے۔ سو فی صدی مومن پیدا کرنا کیا دشوار تھا، لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خدا کا منشا بالجبر مومن پیدا کرنا نہیں اسے ایسے مومن چاہئیں جو خیر و شر میں تمیز کرنے والے ہوں اور حق و باطل کی پیکار میں حق کا ساتھ دیں۔ اگر تمام ہستی میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوتیں اور ہر ہستی میں از روئے فطرت و آفرینش کاملاً صداقت پائی جاتی تو اچھوں اور بُروں میں کوئی فرق نہ رہتا۔ سب کے سب بے امتحان اچھے ہی ہوتے۔ شر اور باطل روح کی ورزش کا سامان ہیں جو روحیں اس امتحان میں کامیاب ہونگی وہی اس درجے کو پہنچیں گی جہاں آدم صفی مسجودِ ملائک بن جاتا ہے۔ انسان کے علاوہ تمام ہستیاں مجبور ہیں اپنی اپنی مقررہ فطرت کے تقاضوں سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتیں:

گر چو چرخِ فلک گردی سر بر سرِ فرماں نہ   در گوئے زمیں باشی وقفِ خم چوگاں شو

ملائکہ کا بھی یہی حال ہے خدا نے ان کو اطاعتِ محض کے لئے پیدا کیا احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ان کے لئے ناممکن ہے مافی السمٰوات ومافی الارض زبانِ حال سے تسبیح خواں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر دنیا میں خیر و خوبی کے سوا کچھ نہ ہو تو وہ امتحان گاہ نہیں بن سکتی اور اس کے برعکس اگر ہستی سراسر باطل ہو تو بھی حق شناسی اور حق کوشی کی اس میں قطعاً گنجائش نہ ہو۔ خیر و شر اور حق و باطل کی آمیزش ہی سے انسانوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان میں کامیاب انسان رفتہ رفتہ اخلاقِ الٰہیہ سے متصف ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح خدا آزاد ہو کر مصدرِ خیر ہے اسی طرح انسان اختیار اور آزادی سے خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ مجبوری کی عصمت بھی کوئی عصمت ہے۔ بقول شخصے

عصمتِ بی بی است از بے چادری

اصل تقوٰے وہ ہے جو تمام اسباب و محرکات کی موجودگی میں بھی مصئون و محفوظ رہے۔

گر نہ معیوبات باشد در جہاں   تاجراں باشند جملہ ابلہاں
پس بود کالہ شناسی سخت سہل   چونکہ عیبے نیست چہ نااہل و اہل

در ہمہ عیب است دانش سود نیست   چوں ہمہ چوب است اینجا عود نیست
انکہ گوید جملہ حق است احمقی است
وانکہ گوید جملہ باطل او شقی است

اس ضمن میں مولانا ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف عود کرتے ہیں جو خارجی فطرت کے متعلق ہے فرماتے ہیں کہ فطرتِ خارجی میں تغیرِ احوال کا مشاہدہ کرو۔ یہاں موسم بدلتے رہتے ہیں کبھی سرما ہے کبھی گرما، کبھی بہار کبھی خزاں کبھی ابر و باد و برق ہے۔ فطرت کے احوال میں گوناگونی اختلاف اور خرق ہے۔ فطرتِ مادی کو یوں سمجھ لو کہ وہ خدا کے خزانوں کی چوبہ ہے۔ چور سے مالِ مسروقہ برآمد کرنے کے لئے تجربہ کار پولیس افسر (شحنہ) کیا کیا ترکیبیں کرتے ہیں کبھی لطف سے کام لیتے ہیں کبھی قہر سے کبھی چاپلوسی کرتے ہیں اور کبھی اقبالِ جرم نہ کرنے والے چور کو اُلٹا لٹکا دیتے ہیں۔ لطفِ شحنۂ تقدیر کو موسمِ بہار سمجھو اور قہر کو موسمِ خزاں۔ زمین کے اندر اور باہر سے جو کچھ نکلتا ہے وہ تغیرِ احوال کی وجہ سے برآمد ہوتا ہے۔ ماہرینِ طبعیات کہتے ہیں کہ کوئلہ اور لعل اصل میں ایک ہی چیز ہیں کروڑوں برس تک بھاری بوجھ کے اندر مدفون رہنے سے کوئلہ لعل بن گیا ہے۔ اگر خزاں نہ ہوتی تو مسلسل بہار بھی نہ رہ سکتی۔ خزاں چوں نباشد بہاراں کجا۔ غرضیکہ ہستی خواہ مادی ہو اور خواہ روحانی اس کے ممکنات و مضمرات کو معرضِ شہود میں لانے کے لئے ہر قسم کے تغیرات و امتحانات کی ضرورت ہے۔ کسی تغیر کو ناگوار سمجھ کر فطرت اور خالقِ فطرت کا شاکی ہونا فقدانِ عرفان کا نتیجہ ہے:

امتحاناتِ زمستان و خزاں   تابِ تابستان، بہارِ ہمچو جاں
بادہا و ابرہا و برقہا   تا پدید آرد عوارض فرقہا
تا برون آرد زمینِ خاک رنگ   ہرچہ اندر جیب دارد لعل و سنگ
ہرچہ دزدیدست ایں خاک دژم   از خزانہ حق و دریائے کرم
شحنۂ تقدیر گوید راست گو   آنچہ بردی شرح وا دہ مو بمو
شحنہ گاہش لطف گوید چوں شکر   گہ بر آویزد کند ہرچہ بتر
تا میانِ قہر و لطف آں خفیہا   ظاہر آید ز آتشِ خوف و رجا

فرماتے ہیں کہ انسان کی ہستی کا بھی یہی حال ہے سرد و گرم زمانہ کے تجربے کے بغیر اس کے ممکناتِ حیات خفیہ و خفتہ رہتے ہیں۔ اگر تم یہ تسلیم کر لو کہ ارواح کی ترقی امتحان کے بغیر نہیں ہو سکتی تو یہ لازم آتا ہے کہ خلاقِ فطرت انسان کو بھوک اور خوف اور نقصانِ مال و جان سے آزمائے۔ اگر اس کی سیرت کا سونا خالص ہوگا تو امتحان کی یہ آگ اس کو ضرر پہنچانے کی بجائے اس کو آلائشوں سے دور کر کے کندن بنا دیگی اگر خس و خاشاک ہوگا تو جل کر راکھ ہو جائیگا۔ مصائب پست فطرتوں کے لئے تباہی کا باعث ہوتے ہیں لیکن اہلِ ہمت کی ہمتوں میں ان سے اضافہ ہوتا ہے اور ہستی میں ان کے درجات بلند ہو جاتے ہیں:

پس مجاہد را زمانے بسطِ دل   یک زمانے قبض و درد و غش و غل

زانکہ ایں آب و گِلے کا بدانِ ماست ۔ منکر و دزدِ ضیائے جانِ ماست

حق تعالیٰ گرم و سرد و رنج و درد ۔ بر تنِ ما می نہد اے شیر مرد

خوف و جوع و نقصِ اموال و بدن ۔ جملہ بہرِ نقدِ جاں ظاہر شدن

اس بیت میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے :

ولنبلونکم بشیٍ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ (سورہ بقرہ)

البتہ ہم تم کو کسی قدر خوف بھوک مال و جان اور پیداوار اراضی کے نقصان سے آزمائیں گے (اے پیغمبر) صبر کرنے والوں کو خوشنودی خدا اور حصولِ مراد کی خوشخبری دو جن پر جب مصیبت آتی ہے تو بول اٹھتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۔

زندگی میں اگر حق و باطل اور نیک و بد کی آمیزش نہ ہوتی تو یہ امتحان اور یہ ابتلا کہاں سے ہوتا ۔ خدا کا تقاضا ہے کہ انسان خود اپنے اندر حق و باطل کی جانچ کی کسوٹی پیدا کرے :

ایں وعید و وعدہا انگیخت است ۔ بہرِ ایں کہ نیک و بد آمیخت است

چونکہ حق و باطلے آمیختند ۔ نقد و قلب اندر چرمداں ریختند

پس محک می بایدش بگزیدۂ ۔ در حقائق امتحاں ہا دیدۂ

مولانا کو ہر صاحبِ عرفان و وجدان کی طرح زبان و بیان کی نارسائی کی شکایت رہتی ہے جب توحید کے غوامض میں غوطہ زنی کرتے ہیں اور اس کے بعد دوسروں کو سمجھانے کے لئے تشبیہ و تمثیل و قال و قیل سے کام لیتے ہیں تو ہمیشہ حیران و پشیمان ہوتے ہیں کہ بیان اظہارِ حقیقت سے قاصر رہا ہے :

ہم اور بیانِ حالِ کسی دم بہم نہیں ۔ ہم ہیں تو بے سخن ہیں سخن ہے تو ہم نہیں

ستاروں کا حساب لگانے اور ان کی گردشوں کا اندازہ کرنے کے لئے ماہرینِ فلکیات ایک آلے کا استعمال کرتے ہیں جسے اصطرلاب کہتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ آسمانِ معرفت کے ستاروں کے لئے نطق کے اصطرلاب سے کام لیتا ہوں لیکن اصطرلاب کو جو ایک بے جان آلہ ہے نجومِ عرفان کی حقیقت سے کیا واسطہ ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ نطق کے مقابلے میں عشق بہتر اصطرلاب ہے :

عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست

اب سرِ توحید اور عارف کی خدا رسی کی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کے بعد فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے سچ فرمایا کہ

من عرف ربہ فقد کلّ لسانہٗ ۔ جس نے رب کو پہچانا اس کی زبان گونگی ہو گئی ۔

آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

مولانا نے اس میں غلطی کی ہے یہ حدیث رسول نہیں ہے بلکہ کسی عارف کا قول ہے :

لفظ در معنی ہمیشہ نارساں — زاں پیمبر گفت قد کلّ اللساں
نطق اصطرلاب باشد در حساب — چہ قدر داند ز چرخ و آفتاب
خاصہ چرخے کایں فلک زاں پرّہ ایست — آفتاب از آفتابش ذرہ ایست

مدینہ منورہ میں منافقین کی مسجد ضرار کا قصہ لکھنے کے بعد حسب معمول اس کو انسان کا اخلاقی اور روحانی زندگی کے لئے سرمایۂ عبرت بناتے ہیں فرماتے ہیں کہ یہ سنگ وخشت کی مسجدیں قلوب کی باطنی مساجد کی ظاہری تصویریں ہیں۔ عبادت کا اصلی مقصد دلوں کے اندر مسجد کی تعمیر ہے۔ جن لوگوں کی عبادت محض دکھاوے کی ہے یا دنیا طلبی کے لئے دام تزویر ہے انہوں نے اپنے اندر مسجد ضرار تعمیر کر رکھی ہے جو سوختنی ہے۔ ایسے واعظ جو محراب و منبر پر جلوہ فرماتے ہیں ان کے باطن کا ان کے ظاہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لوگوں کو توبہ کی تلقین کرتے ہیں لیکن خود اغراضِ اسفل میں گرفتارِ ہوس ہیں۔ اس قسم کے امام اور مقتدی سب مسجدِ ضرار کے معمار ہیں :

زنہار زاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

مولانا نصیحت فرماتے ہیں کہ اپنے دل کی کسوٹی پر اپنے محرکات اور اعمال کو پرکھتے رہو اور خبردار رہو کہ کہیں تمہارے اندر مسجد ضرار تو تعمیر نہیں ہو رہی جو ابلیس کے سامنے نفاق و ریا و زرق کی سجدہ گاہ ہے۔ اے کہ تو منبر پر بیٹھ کر مسجد ضرار کا قصہ لوگوں کو سناتا ہے اور منافقوں کی ہنسی اڑاتا ہے جب تو اپنے باطن کا محاسبہ کرے گا تو تجھے اپنے اندر ہی مسجد ضرار نظر آجائے گی :

بر محک زن کارِ خود اے مردِ کار — تا نسازی مسجدِ اہلِ ضرار
بس بر آں مسجد کناں تسخر زدی — چوں نظر کردی تو خود زایشاں بدی

اس کے بعد ایک قصہ بیان فرماتے ہیں جو برصغیر ہند و پاکستان میں مشہور عوام ہو گیا ہے کہ چار گنوار مسجد میں باجماعت نماز کے لئے نیت باندھ کر کھڑے ہوئے۔ ابھی نماز پوری نہ ہوئی تھی ایک دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ مؤذن مسجد میں داخل ہوا۔ ایک گنوار نمازی یک بیک بول اٹھا کہ موذن صاحب نماز کا وقت ہو چکا ہے آپ نے بانگ کہی یا نہیں۔ دوسرے گنوار نے اس کو آہستہ سے تنبیہ کی کہ میاں نماز میں نہیں بولا کرتے تمہاری نماز ٹوٹ گئی ہے۔ تیسرے نے کہا کہ بھئی اس کو کیا کہتے ہو خود تم بھی تو بول اٹھے تمہاری نماز بھی تو گئی۔ چوتھے نے کہا خدا کا شکر ہے کہ ہم تو نہیں بولے۔ اس سے مولانا اس

سبق کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنی فکر نہ کرنے اور دوسروں کی عیب چینی اور عیب نمائی سے خود عیب جو کے اخلاق فاسد ہوجاتے ہیں ـــــــ

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

پس نماند ہر چہاراں شد تباہ　　عیب گویاں بیشتر گم کردہ راہ

اے خنک جانے کہ عیبِ خویش دید　　ہر کہ عیبے دید آں بر خود خرید

حدیث شریف میں ہے کہ:

طوبیٰ لمن شغلہٗ عیبہ عن عیوب الناس۔　　مبارک ہے وہ شخص جس کا اپنا عیب اسے لوگوں کے عیوب پر نگاہ ڈالنے سے باز رکھے۔

ایک دوسری حدیث ہے:

السعید من وعظ لغیرہٖ۔　　خوش نصیب ہے وہ جو دوسروں کے اعمال سے نصیحت حاصل کرے۔

پند گیر از مصائب دیگراں　　تا نگیر ند دیگراں ز تو پند

نہ تھی حال کی اپنے جو ہم کو خبر　　رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر　　تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا (ظفر)

مندرجہ صدر اشعار کے بعد مولانا نے ایک شعر کہا ہے جس کی شرحیں مختلف بیان کی ہیں۔ شعر یہ ہے:

زانکہ نیمے رو زعیبستان بدست　　واں دگر نیمش زغیبستان بداست

انسان کی ہستی کا نصف تو عیبستان ہے یعنی سراسر عیوب سے معمور ہے اور دوسرا حصہ غیبستان ہے جو اس کیلئے عالمِ غیب ہے۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک معنی یہ ہے کہ انسان کی ظاہری اور عملی زندگی عالمِ شہود و ظہور میں بسر ہوتی ہے لیکن اس کی روح کی اصلی ماہیت نظروں سے اوجھل ہے یعنی انسان عالمِ شہادت اور عالمِ غیب کا نقطۂ اتصال ہے۔ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ انسان کے اندر جو عیوب ہوتے ہیں وہ خود اس کو نظر نہیں آتے۔ وہ اس کی نگاہوں اور اس کے شعور سے غائب رہتے ہیں۔ یعنی اپنے عیوب کے معاملے میں جو اس کے اپنے شعور کا حصہ ہے وہ سراسر غائب ہے۔ جیسا کہ انجیل میں حضرت مسیح نے فرمایا کہ عیب جو انسانوں کو دوسروں کی آنکھ میں تو تنکا بھی نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ میں اگر شہتیر بھی ہو تو نظر نہیں آتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کے ذہن میں ان دو معانی میں سے کون سے معنی تھے۔ باتیں دونوں درست ہیں اور مولانا کے مذاق اور ان کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ اس سے اگلے شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر تیرے اپنے سر پر دس زخم ہیں تو تجھے اپنے اوپر رحم کھانا اور علاج کرنا چاہیئے۔ کسی شخص کو اپنے سر کا گنج نظر نہیں آتا،

کیونکہ اس کی نگاہ اپنے سر کے اوپر نہیں پڑ سکتی مگر دوسروں کے سروں پر فوراً نگاہ پڑتی ہے اس لئے دوسرے کو آدمی گنجا کہنے کو فوراً تیار ہو جاتا ہے:

چونکہ بر سر مر ترا دہ ریش ہست | مرہمت بر خویش باید کار بست

اپنے زخم یا عیب سے واقف ہو جانا ہی علاج کا اوّلین قدم ہے:

عیب کردن ریش را داروے اوست | چوں شکستہ گشت جائے ارحمو ست

اگر تم میں وہی عیب موجود ہے جس کی بابت تم دوسروں پر طعنہ زنی کرتے ہو تو بے خوف نہ ہو۔ اس امر کا قوی احتمال ہے کہ ایک دن تمہارا اسی قسم کا عیب دوسروں پر فاش ہو جائے:

گر ہماں عیبت بود ایمن میاش | بو کہ آں عیب از تو گردد نیز فاش

دنیا میں عالمگیر ادیانِ عالیہ میں اسلام بحیثیت زمانہ آخری دین ہے مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے یہ باعثِ شکر ہونا چاہئے۔ اُمم ماضیہ کے حالات بہت سبق آموز ہیں۔ کس کس ملت یا قوم نے کیا کیا اعمال کئے اور ان کا کیا کیا نتیجہ ہوا وہ تمام تاریخ مسلمانوں کے سامنے رکھ دی گئی۔ السعید من وعظ لغیرہ۔ اقوام پارینہ کی بداعمالیوں اور ان کی سزاؤں کا نقشہ سامنے رکھ کر مردِ مومن خود مبتلا ہونے کے بغیر سبق اور عبرت حاصل کر سکتا ہے اور سزا سے بچ کر اس کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس تعلیم کو ایک قصے میں پیش فرماتے ہیں کہ ترکوں کی ایک غارت گر قوم تھی جنہیں غز کہتے ہیں۔ ان غزوں نے ایک گاؤں پر تاخت کی، ایک شخص کو پکڑا اور اسے ذبح کرنے لگے، اس نے کہا اے بہادر سردارو میں نے کیا گناہ کیا ہے، مجھ مسکین و بے نوا کو قتل کرکے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ ڈاکو بولے کہ دیکھو وہ ایک دوسرا شخص وہاں بندھا ہے اس پر ہمیں قوی شبہ ہے کہ اس نے دولت چھپا رکھی ہے لیکن ہمیں پتہ نہیں دیتا ہم تم کو اس کے سامنے اس لئے قتل کر رہے ہیں کہ اس کے دل میں ہیبت پیدا ہو کہ اگر میں نے چھپائے ہوئے مال کا پتہ نہ بتایا تو مجھے ذبح کر دیں گے۔ وہ شخص مفلس بنتا ہے مگر ہم کو شبہ ہے کہ وہ مفلس نہیں مال کو چھپانے کے لئے مکر کر رہا ہے۔ جیسے ذبح کرنے لگے تھے اس نے کہا کہ نہ تم اس کے حال سے یقینی طور پر واقف ہو اور نہ میری حیثیت کے متعلق تمہیں کوئی یقین ہو سکتا ہے۔ کیا اس کا احتمال نہیں کہ مالدار اصل میں میں ہوں اور وہ درحقیقت مفلس ہو۔ تم اُسے ذبح کرکے میرے لئے ہیبت کا ذریعہ کیوں نہیں بناتے۔ مناسب بات کیا یہ نہ ہوگی کہ تم اس کو ذبح کرو تاکہ میں خوف زدہ ہو کر تمہاری غرض کو پورا کر دوں۔ اس سے مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بعد میں آنے والا اگر عبرت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو گذشتہ سزایاب اُمتوں کی تاریخ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی لئے رسولِ کریم نے فرمایا کہ:

نحن الآخرون السابقون۔ | ہم آخر میں پیدا ہوئے مگر پہلوں سے آگے ہو گئے

قرنِ آخر والے قرونِ پیشیں سے آگے نکل گئے :

پس کرم ہائے الٰہی بیں کہ ما آمدیم آخر زماں در انتہا
آخرین قرنہا پیش از قروں در حدیث است آخرون السابقون
تا ہلاک قوم نوح و قومِ ہود عارضِ رحمت بجانِ ما نمود

دنیا طلبی میں راسخ اور خدا طلبی میں بہانے کرنے والے منافقوں کا حال لکھتے ہیں کہ تم ان سے کچھ اس قسم کی باتیں سنو گے کہ ہمارے ایمان میں تو کوئی خلل نہیں، خدا کے فضل سے ہم مومن ہیں لیکن کیا کریں کہ یہ روزی کے دھندے اور زن و اولاد کے لئے نفقہ اندوزی کے پھندے خدا کی عبادت میں مصروف ہونے سے مانع ہیں روزی کمانے میں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی نماز کہاں سے پڑھیں اور خلقِ خدا کی خدمت کہاں سے کریں۔ اور روزی کے متعلق پوری دیانت اور ایمان داری کو ملحوظ رکھیں تو بال بچوں کے اخراجات پورے کرنے مشکل ہیں۔ جی تو ہمارا بھی چاہتا ہے کہ دینی زندگی بسر کریں لیکن دنیا کے دھندے فرصت نہیں دیتے۔ مولانا فرماتے ہیں سمجھ لو کہ یہ شخص معذور نہیں بلکہ منافق ہے جب یہ کسی مردِ خدا سے درخواست کرتا ہے کہ دُعا کیجئے کہ خدا ہم کو بھی توفیق دے کہ رفتہ رفتہ ہم بھی ولی اللہ بن جائیں تو یہ تقاضا اس کے دل سے پیدا نہیں ہوتا۔ یونہی سطحِ شعور پر ایک بے اصل تمنا کی ہلکی سی لہریں پڑتی ہیں! اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص سستی کا مارا اونگھتے اونگھتے کوئی بڑ ہانکے اور اس کے بعد سو جائے۔

دنیا دار منافق کہہ رہا ہے :

یا منافق وار عذر آری کہ من ماندہ ام در نفقۂ فرزند و زن
نے مرا پروائے سر خاریدن است نے مرا پروائے دین ورزیدن است
اے فلاں مارا بہمت یاد دار تا شویم از اولیاء پایان کار
ایں سخن نے ہم ز درد و سوز گفت
خوابناکے ہرزہ گفت و باز خفت

یہ شخص جھوٹ بکتا ہے کہ میں بڑی جانکاہی سے کسبِ حلال کرتا ہوں تاکہ عیال کے لئے روزی مہیا ہو سکے۔ ہم سے پوچھو تو ہم کہیں گے کہ اس منافق گمراہ کی روزی حلال نہیں ہے بلکہ ایسے منافق کا صرف خون مسلمانوں کے لئے حلال ہے ایسے مکار کا تو سر اڑا دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ روزی کمانے کے بغیر چارہ نہیں لیکن یہ کم بخت خدا کے بغیر رہ سکتا ہے روزی کے بغیر نہیں رہ سکتا :

ہیچ چارہ نیست از قوتِ عیال　　از بنِ دنداں کنم کسب حلال
چہ حلال اے گشتہ از اہلِ ضلال　　غیر خونِ تو نمی بینم حلال
از خدایت چارہ است قوت نے
چارہ است از دین واز طاغوت نے

مولانا پھر مسجد کے مضمون کی طرف عود کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بے وقوف مسلمانوں کو دیکھو کہ مسجد کی تو تعظیم کرتے ہیں یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ کوئی اس کو گرائے یا اس کے کسی حصے کو گندا کرے لیکن یہی مسجد پرست لوگ نیکوں کی دل آزاری سے دریغ نہیں کرتے سنگ وخشت کی مسجد تو مجازی مسجد ہے اصل مسجد تو اخلاقی اور روحانی مردانِ خدا کا دل ہے جس کا احترام جو ہر دین اور عینِ عبادت ہے۔ انسانوں کو ذلیل کرنا اور آزار پہنچانا اور اینٹ پتھر کی مسجد کی تعظیم کرنا احمقوں کا شیوہ ہے :

ابلہاں تعظیم مسجد می کنند　　در جفائے اہلِ دل جد می کنند
آں مجاز است ایں حقیقت اے خراں　　نیست مسجد جز درونِ سروراں
تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد　　ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

مسجدوں کے متعلق جھگڑے فرقہ پرست مسلمانوں میں عام ہیں۔ آئے دن مساجد کے سلسلے میں فساد ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے نے قرآن میں مساجد میں خدا کی عبادت کرنے والوں کو روکنا کفار کا شیوا قرار دیا ہے مگر مسلمان ہیں کہ کلمہ گو خدا اور رسول کو ماننے والوں کو اگر وہ ان کے مخصوص فرقے کے نہ ہوں تو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ ہم نے لاہور میں ایک بڑی مسجد میں جو قدیم شاہی زمانے کی عظیم الشان مسجد ہے منبر و محراب کے قریب ایک تختہ آویزاں دیکھا جس میں مسلمانوں کے کچھ فرقوں کے نام درج تھے کہ ان لوگوں کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ ایک اور مسجد میں یہ تماشا دیکھا کہ مولوی صاحب غیر معمولی کوشش سے مسجد کی صفائی میں کوشاں ہیں، فرشوں اور دیواروں کو رگڑ رگڑ کر دھو رہے ہیں پانی کا ڈول پر ڈول بہا رہے ہیں، پوچھا کہ مولانا آپ کی یہ سعئ طہارت مسجد نہایت پسندیدہ فعل ہے مگر آج یہ غیر معمولی صفائی کیوں ہو رہی ہے ؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں کہ ایک وہابی کتا آج اس میں نماز پڑھتے ہوئے بلند آواز سے آمین کہہ گیا ہے۔ اس نجس نے مسجد کو پلید کر دیا اس لئے زیادہ کوشش سے اسے صاف اور پاک کر رہا ہوں۔ ایسے ہی اسلام کے نادان دوستوں کی نسبت مولانا نے فرمایا ہے کہ مسجد کی تو تعظیم کرتے ہیں لیکن مومنوں کا دل دکھاتے ہیں۔